

## امیر خسرو کا لسانی شعور — تعارفی جائزہ

### The Language Perception of Ameer Khusro: An Introductory Study

#### Abstract:

Ameer Khusro holds a unique position among the writers and poets of the Subcontinent due to his multifaceted personality. His perspectives on the diverse languages and vernaculars of the region are intricately woven into his prose and poetry, showcasing his encyclopedic mind and appreciation for linguistic diversity. Khusro often adopts a stance akin to a modern linguist, drawing comparisons among these languages and offering insightful conclusions. This article delves into his fascination with various languages, particularly his preference for 'Hindvi' and Persian, as evidenced in his works, *Dībāchah-i Ghurat Al-Kamāl* and *Masnavī Nahu Sa'pehar*.

**Keywords:** Khusro, Hindi, Urdu, Sanskrit, Diversity Poetry.

ہندوستان میں فارسی کے اثرات عہدِ مغلیہ (۱۵۲۶ء-۱۸۵۷ء) میں اپنے عروج پر تھے۔ یہی وہ دور ہے جب فارسی کے زیر اثر ایک نئی زبان بہ تدریج نکھر کر سامنے آئی۔ ہندوستان کا فارسی سے رابطہ محض ایران کے توسط سے نہیں بلکہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے واسطے سے بھی تھا۔ سلطنتِ غزنویہ (۹۷۶ء-۱۱۸۶ء) میں فارسی مسلمانوں کی علمی زبان بن رہی تھی، جس کا منبع وسطی ایشیا یا ماوراء النہر ہے۔ ہند-ایران تعلقات اور ہندوستان میں فارسی زبان کی قدامت کے حوالے سے وحید مرزا کی تحقیق کے مطابق:

... ایران اور ہندوستان... کے باہمی تعلقات بہت قدیم ہیں اور ایرانی زبان و ثقافت سے یہاں کے باشندے ولادتِ مسیح سے بہت پہلے مانوس ہو چکے تھے۔ چنانچہ عرب جغرافیہ دان ابن حوقل کا یہ قول کہ... دسویں صدی عیسوی کے اواخر ۹۷۷ء/ ۳۶۷ھ میں مکران میں فارسی زبان بولی جاتی تھی یا بشاری کا یہ قول کہ اسی زمانے میں ملتان میں فارسی زبان سمجھی جاتی تھی، کسی طرح بھی ناقابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔ پھر جب پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں... پنجاب غزنوی سلطنت کا جزو بن گیا تو ایران اور ہندوستان کے باہمی

روابط کو مزید تقویت پہنچی اور فارسی زبان کا رواج زیادہ عام ہو گیا۔ غزنوی عہد کے دوران میں برصغیر میں فارسی زبان و ادب کا بڑا امر کزلا ہو رہا تھا...  
 یہی وہ ماحول ہے جس میں مسعود سعد سلمان (۱۰۳۶ء-۱۱۲۱ء) اور پھر امیر خسرو (۱۲۵۳ء-۱۳۲۵ء) سامنے آتے ہیں۔

ورڈزور تھ (William Wordsworth- ۱۷۷۰ء-۱۸۵۰ء) کی تمہید<sup>۲</sup> اور حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۳ء) کے مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) کی طرح امیر خسرو کی شاعری کے تیسرے دیوان: غرة الکمال (۱۲۹۳ء) کے دیباچے نے شاعری کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل کی۔ ان تینوں دیباچوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں شاعری کی ماہیت اور روایت کے بارے میں بنیادی باتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی اجتہادی نوعیت کی باتیں بھی کہی گئی ہیں جنہیں ان کا زمانہ آسانی سے سننے کو تیار نہ تھا، مگر بعد کے زمانوں میں جن کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

دیباچہ غرة الکمال کو برصغیر میں فارسی میں فن شاعری اور اس کے متعلقات پر بجا طور پر پہلی اہم نثری تنقیدی تحریر کہا جاتا ہے۔ اس میں خسرو نے کئی مسائل و مباحث چھیڑے ہیں، جیسے: شاعری کی ماہیت، شاعری اور نثر میں فرق، شاعری اور شاعروں کی اقسام، شعر اور موسیقی کے باہمی تعلق، عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ، لفظ اور معنی میں رشتہ، معنی کی اقسام، شاعری کو دیگر علوم پر فوقیت۔ نیز اسی دیباچے میں ہندستان کی بولیوں اور زبانوں کے تعلق سے، خالص لسانی حوالے سے خسرو کا موقف سامنے آتا ہے۔ اس موقف کی لسانی اور ثقافتی اہمیت آج زیادہ روشن ہے، اور اس تحریر کا ایک محرک بھی ہے۔ اسی طرح مثنوی نہ سسپہر میں بھی درجنوں ایسے اشعار ہیں جو براہ راست ہندوستانی بولیوں اور زبانوں کی اہمیت اور ان کے آپس کے تال میل سے متعلق ہیں۔

اردو دان طبقے کو عام طور پر دیباچے کی اہمیت کا اندازہ رہا ہے، مگر اس کے باوجود اس کے بارے میں محض سرسری جملوں پر اکتفا کیا گیا۔ اسے علم و ادب کا گنجینہ اور علمی رموز و نکات کا خزانہ کہا گیا ہے اور امیر کی سوانح عمری اور ان کی تصانیف کے تذکرے کے طور پر اہمیت بیان کی گئی۔ مثال کے طور پر شبلی کی شعر العجم میں امیر خسرو کے ضمن میں اس دیباچے کی اہمیت کا صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے امیر کے حالات جاننے میں مدد ملی۔ اسی طرح نثار احمد فاروقی (۱۹۳۴ء-۲۰۰۳ء) نے دیباچے کی اہمیت پر صرف یہ لکھا: ”اس کے طویل دیباچے سے امیر خسرو کے سوانح حیات کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔“<sup>۳</sup>

مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی / اردو زبان کو سنوارنے میں خسرو نے اہم کردار ادا کیا۔ ہندی زبان و ادب کی ابتدائی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: اپ بھرنش، ویرگاتھا کال اور بھگتی کال۔ جدید ہند آریائی زبانوں کا آغاز پراکرتوں کے زوال سے (دوسری ہزاری کی ابتدا میں) شروع ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں اپ بھرنش کا علاقہ راجپوتانہ اور پنجاب سے بنگال تک پھیلا ہوا تھا۔ ابتدائی ہندی کے آثار اپ بھرنش کے آخری دور میں موجود ہیں۔ دوسری ہزاری عیسوی کی پہلی دو صدیوں کو اپ بھرنش کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کے بعد دھیرے دھیرے ہندی ایک واضح شکل اختیار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد کے

دور کو ویرگاتھا کال یارزمیہ منظومات کا دور (تیرہویں صدی عیسوی) کا نام دیا گیا ہے۔ محمد حسن ان ادوار کے پس منظر میں امیر خسرو کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ویرگاتھا کال کے خاتمے کے قریب زبان کے خدوخال زیادہ واضح ہوتے نظر آتے ہیں۔ عام بول چال کی زبان میں تصنیف و تالیف کا رواج بڑھتا جا رہا تھا اور کھڑی بولی اور برج بھاشا منجھ کر ایک نیا ادبی روپ اختیار کرنے لگی تھیں۔ اس سلسلے میں امیر خسرو اور ودیپتی کے کلام کا مطالعہ کافی مفید ہو گا۔<sup>۴</sup>

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ہندی زبان کی تاریخ سے مراد اردو زبان کی تاریخ بھی ہے۔ نثر یا شاعری سے جو قدیم نمونے اردو کے ثبوت میں لائے جاتے ہیں، وہی ہندی کے ثبوت میں بھی ہیں۔ رسم الخط کا معاملہ جدا ہے۔ لہذا خسرو نے جس زبان کو 'ہندوی' کہا اس سے مراد یہ دونوں ہیں۔ گویا تیرہویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک زبان کے جس قدر بھی نام موجود ہیں: ہندوی، ہندی، دکنی، گجراتی، کھڑی بولی، ریختہ وغیرہ، یہ سب ایک ہی زبان کے لیے برتے گئے، جس کی ترقی یافتہ شکل بعد میں اردو کہلائی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں 'ہندوی' بہر حال شعر یا نثر میں اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود نہ تھی۔ بقول جمیل جالبی (۱۹۲۹ء-۲۰۱۹ء) مقامی زبانوں اور عربی و فارسی کے تال میل سے جس نئی زبان کا ہیوٹی تیار ہو رہا تھا خسرو کے دور تک اس میں محاورات، روزمرہ اور ضرب الامثال معقول حد تک بول چال میں برتے جانے لگے۔ دربار سرکار کی زبان فارسی تھی اور:

اہل علم و ادب اسے وہ اہمیت نہیں دے رہے تھے جو فارسی کو ملی ہوئی تھی۔ اسی لیے ہر طرف بولے اور سمجھے جانے کے باوجود، اس میں ادب و اسلوب کی کوئی زندہ روایت پیدا نہیں ہوئی۔ اس سے اس دور میں زیادہ سے زیادہ دو کام لیے جا رہے تھے؛ ایک تو یہ کہ اسے تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھار ہلکے پھلکے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اور دوسرے صوفیائے کرام اور مصلحین اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اسے استعمال کر رہے تھے۔<sup>۵</sup>

خسرو سے قبل مسعود سعد سلمان سے ہندوی کلام منسوب ہے۔ خسرو نے بوجہ اپنے ہندوی کلام کو محفوظ کرنے پر زیادہ توجہ نہ دی، تاہم دیباچے میں اس بات پر فخر کیا کہ یہ ان کی اختراع ہے کہ اگر ایک مصرع فارسی کا ہے تو دوسرا ہندوی / اردو / ہندی کا۔ امیر خسرو کے دیباچے سے اس عہد کے دہلی کی علمی و ادبی فضا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہاں کے عالم دنیا میں ممتاز ہیں۔ اس بات کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ عرب، خراسان اور ترکی کے افراد یہاں آکر اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں اور اپنی اپنی زبانوں میں شعر کہتے ہیں، جب کہ ہندستان اور خصوصاً دہلی کے لوگ جب دوسرے ممالک میں جاتے ہیں وہاں کی زبانوں میں بھی شعر کہتے ہیں۔ دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اگرچہ ہندوستانی عرب ممالک اور ایران نہیں گئے، پھر بھی عربی اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی زبان کے بارے میں وہ ایران اور ہندستان میں کوئی خاص فرق نہیں کرتے، تاہم خراسانی کو وہ معیار تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا تلفظ درست نہیں۔

جہاں تک اُس فارسی زبان کا تعلق ہے جو اہل زبان کے واسطے سے (یہاں) پہنچی ہے، سوائے ماوراء النہر کی فارسی

کے جو ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے، کسی اور خطے کی (فارسی) عبارت درست نہیں ہے<sup>۱</sup>۔  
شعر، فن شعر اور شعر اپر بات کرنے سے پہلے خسرو بنی نوع انسان کی قوت گویائی کی اہمیت پر جامع بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خالق نے گویائی کو بنی نوع انسان کی تہذیب کی تکمیل کا لطیف ترین معیار مقرر کیا ہے۔ گویا اسی قوت گویائی کی بدولت علوم و فنون کو اظہار ملا۔ اس طرح یہ قوت انسان کو قدرت کی طرف سے سب سے بڑا عطیہ شمار ہونی چاہیے۔ خسرو نفس ناطقہ کو انسان کا حقیقی وجود اور نعمت کُلّی قرار دیتے ہیں، اور نفس ناطقہ کا کمال کلام ہے۔ اسی استدلال کی رو سے وہ نظم کو نثر پر فوقیت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جیسے عامتہ الناس حیوانات کے گروہ سے ممتاز ہیں، اسی طرح انسانوں میں خاص افراد، جو دنیائے سخن میں تصرف رکھتے ہیں اور صاحب نظر ہیں عام انسانوں سے ممتاز ہیں۔

جس طرح اس قوت کی بدولت انسان حیوانات و جمادات پر فضیلت رکھتا ہے، اسی طرح جو انسان 'مصارفِ کلام' میں زیادہ تصرف رکھتا ہے، وہ اسی درجہ صاحب منزلت اور صاحب بصیرت ٹھہرتا ہے۔ جس شخص نے اپنی اس قوت کا بھرپور استعمال نہیں کیا تو دراصل اس کے 'نفس ناطقہ' پر 'نفس حیوانی' کا غلبہ رہا۔ بظاہر یہ سادہ سی بات ہے مگر بے حد سخت۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں الفاظ پر تصرف رکھنے والے شخص یعنی شاعر / ادیب کی کیا منزلت ہے، گویا جو نسبت حیوان اور انسان میں ہے وہی نسبت الفاظ کی اہمیت سے بے بہرہ شخص اور ان کی اہمیت کو جان کر انھیں برتنے والے شخص میں ہے۔ موجودہ لسانیات، اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ قوت گویائی صرف انسانوں سے مخصوص ہے۔ تمام انواع باہم گفتگو و ابلاغ کا سلسلہ رکھتی ہیں۔ انسان کی زبان، وضعی اور مصنوعی ہے، جب کہ چرند پرند اور نباتات کی جبلی و فطری ہے۔ البتہ خسرو کی یہ بات اہم ہے کہ دنیائے سخن میں تصرف رکھنے والے ممتاز ہیں، اس لیے کہ ان کی زبان پر دست رس، روزمرہ ضرورتوں کے ابلاغ تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ داخلی و وجدانی اور تخلیقی ضرورتوں تک پھیلی ہوتی ہے اور وہ اسی بنا پر صاحب نظر ہوا کرتے ہیں۔

خسرو، اس دیباچے میں عربی زبان کو مذہبی بنیاد پر فارسی پر فضیلت دیتے ہیں مگر شعری لحاظ سے فارسی کو برتر ثابت کرتے ہیں۔ دلائل لانے کی ذہن میں وہ ایک منفرد مثال لاتے ہیں کہ فارسی شاعر عربی الفاظ کو درست ادا کرنے پر قادر ہے، جب کہ عربی شاعر اپنی زبان سے کبھی 'گو' ادا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ 'کو' کہے گا۔ یہاں خسرو انصاف کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ مخارج کا معاملہ ہے۔ ہر خطے کے لوگ کچھ اصوات ادا کرنے پر قادر ہیں اور کچھ نہیں۔ لسانی اعتبار سے یہ خوبی ہے نہ خامی۔ اس اعتبار سے زبانوں کے مابین موازنہ غلط نتائج پیدا کرے گا۔ عمومی طور پر ہر شخص کے مخارج (vocal cords) اس کی مادری زبان کے مطابق ڈھلے ہوتے ہیں اور جب وہ کوئی دوسری زبان بولے گا تو وہ ان اصوات کو ادا نہیں کر پائے گا جو اس کی مادری زبان میں موجود نہیں۔ مادری زبان میں جو صوت موجود نہیں، اس کی جگہ ثانوی زبان کی قریب ترین صوت لے لیتی ہے، جیسے ایک عربی پاکستان کو 'پاکستان' کہے گا۔ ہر زبان اصوات کا علیحدہ نظام رکھتی ہے۔

فتح ایران کے بعد فارسی رسم الخط میں تبدیلی آئی اور عربی حروفِ تہجی اور رسم الخط اختیار کیے گئے۔ فارسی نے عربی حروفِ تہجی میں چار نئے حروف کا اضافہ کیا: پ، گ، چ، ژ۔ اگرچہ زیادہ سے زیادہ حروف کی ادائیگی پر قدرت ایک بڑی خوبی ہے،

لیکن اصل کمال اس خوبی کو برتنے کا ہے۔ اردو کا رسم الخط بھی عربی سے مستعار ہے اور فارسی میں اضافہ شدہ چار حروف (پ، گ، ج، ٹ) بھی اردو زبان کا حصہ ہیں۔ اردو نے اپنی مقامی ضرورت کے تحت ہندی / سنسکرت سے بھی آوازیں / حروف لیے۔ زبان دان سے بڑھ کر خسرو ایک ماہر لسانیات کی مانند مختلف خطوں کی زبانوں میں فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں اور دہلی کے مقام کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے یہ دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ دہلی کے شاعر سارے عالم سے بہتر شاعر ہیں۔ ہندی نژاد بھی، خواہ شہری ہو یا دیہاتی، ساکنانِ دہلی کے سامنے اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔

۲۔ خراسانی، عراقی، شیرازی ہوں یا ترک سب سے زبان ہندوی میں غلطی سرزد ہوگی، ”البتہ وہ صاحبِ انشا جس نے ہندوستان کے شہروں خصوصاً دہلی میں نشوونما پائی ہے، اہل انشا کی مستقل ہم نشین کے بغیر، ہر طریقے پر جو اہل انشا بولتے ہیں بات کہہ سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے اور نظم و نثر میں تصرف کر سکتا ہے اور جس ملک میں جائے وہاں کے باشندوں کی روش پر گام زن بھی ہو سکتا ہے“<sup>۸</sup>۔

ان دو دلائل میں چند اہم نکات پوشیدہ ہیں۔ خسرو کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا۔ انھوں نے دہلی کا عروج و زوال اور بہت سے بادشاہ آتے جاتے دیکھے۔ نابغہ روزگار شخصیات کی قدر دانی اور ان کے اثرات دیکھے، ماوراء النہر، ایران، ترکی اور عرب علاقوں کے کالمین فنون کا دہلی کی طرف رجوع دیکھا، سر زمین دہلی میں صوفیہ اور مخلوق کا ان کی طرف کھینچنا دیکھا، دہلی اور اس کے اطراف میں زبانوں کا تامل میل دیکھا۔ نہ جانے کیسے کیسے آسمان سر زمین دہلی میں جذب ہو کر اسے منفرد مقام بنا رہے تھے۔

منشوی نہ سپہر دراصل ہندستان کی فضیلت کے بارے میں ہے۔ ایک فضیلت یہاں کی زبانوں اور بولیوں کی بھی گنواتے ہیں:

ما بدرستی سخن هر همه را  
زان نمط آریم کہ راعی رمہ را

کاین طرف از هر طرفی اهل هنر  
در طلب علم و هنر کردہ گذر  
لیک بتحصیل حکم بہر شرف  
برہمن از ہند نشد ہیچ طرف؟

’دیباچے‘ میں بھی یہی نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ’ہر ملک‘ سے خسرو کی مراد یقیناً عرب دنیا، فارس اور وسط ایشیا یا ماوراء النہر کی زبانیں ہوں گی۔ ایسا کہنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان، خصوصاً سلاطین کے دور (۱۲۰۶ء-۱۵۲۶ء) کو کئی لحاظ سے فضیلت حاصل تھی۔ یہاں کی تہذیب، روایات، مذاہب، علم و ادب اور زبانوں سے ابن بطوطہ (۱۳۰۳ء-۱۳۶۸ء) اور البیرونی (۹۷۳ء-۱۰۴۸ء) جیسے لوگ بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ مختلف خطوں سے علوم و فنون کے ماہرین

یہاں آکر بسنا پسند کرتے تھے۔ اس مثنوی نے اس تاریخی حقیقت کو محفوظ کر لیا۔ اپنی جغرافیائی وسعت، اقوام، زبانوں، ثقافت و مذاہب میں تنوع کے باعث ہندستان کو برصغیر بلکہ برعظیم کا درجہ دیا جاتا ہے۔

اردو کی ابتدا کے حوالے سے ہونے والی بحثوں میں 'ہندوی' خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی میں ہندوستان کی بولیوں اور زبانوں کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

الغرض از پارسی و ترک و عرب  
بیہدہ باشد کہ کنم دل بطرب  
من چو ز ہندم بود آن بہ کہ کسی  
از محل خویش بر آرد نفسی  
ہست درین عرصہ بہر ناحیتی  
مصطلحی خاصہ نہ از عاریتی  
سندی و لاہوری و کشمیری و کبر  
دھور سمندری و تلنگی و گجر  
معبری و گوری و بنگال و اود  
دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد\*

عہد وسطیٰ میں ہندستان کو ایک وحدت کی شکل میں دیکھنا اور دکھانا کوئی معمولی بات نہیں۔ دیباچے میں بھی وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس سرزمین پر چند کوس کے بعد زبان یا بولی کا رنگ بدل جاتا ہے۔ زبان جب ایک خاص سطح پر پہنچ جائے تو اصطلاحات وجود میں آسکتی ہیں۔ خسرو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر علاقے کی اپنی زبان میں مختلف پیشوں اور فنون کی اصطلاحات ہیں۔ اس حوالے سے اردو میں مولوی ظفر الرحمن دہلوی کا ایک منفرد کام ہے جو فہرہ ہنگ اصطلاحات پیشہ وراں کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ پیشوں اور فنون کی اصطلاحات میں اگر مقامی رنگ غالب ہے تو علمی اصطلاحات میں سنسکرت اور عربی کا:

ہندوستان میں مدت دراز سے دو زبانیں ذریعہ تعلیم رہی ہیں۔ ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی۔ اسی سبب سے دو مختلف قسم کی علمی اصطلاحیں اب تک اس ملک میں مستعمل ہوتی رہی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنی تعلیمی کتابوں میں سنسکرت کی اصطلاحیں درج کی ہیں۔۔۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے تمام علمی اصطلاحیں عربی سے ماخوذ کی ہیں۔"

اردو کے مختلف ناموں کے حوالے سے بھی 'ہندوی' کا نام لیا جاتا ہے۔ یہاں خسرو جس زبان کو 'ہندوی' قرار دے رہے ہیں وہ دہلی اور اس کے اطراف کی زبان ہے۔ اس حوالے سے حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء) نے پنجاب میں اردو اور گولپی چند نارنگ (۱۹۳۱ء-۲۰۲۲ء) نے امیر خسرو کا ہندوی کلام میں بات کی ہے۔ مزید یہ کہ مختلف زبانوں اور بولیوں کے نام خسرو نے جس طرح یہاں محفوظ کر دیے ماہرین لسانیات کے لیے ان میں تحقیق کا بڑا میدان اب بھی کھلا ہے۔ یہاں بارہ زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

نارنگ ایک اہم سوال اٹھاتے ہیں کہ امیر خسرو سے جو ہندی یا ہندوی کلام منسوب ہے اسے حقیقت میں کس زبان کا نام دیا جائے۔ آج ہندوی، ہندوستانی یا اردو سے جو لسانی مفہیم وابستہ ہیں وہ سات سو برس قبل نہیں تھے۔ نارنگ کے مطابق خسرو نے جن بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے ان سب کو 'ہندوی' کہا ہے۔ اس طرح دلی کا باشندہ ہونے کے سبب ان کی زبان 'دہلوی ہندوی' ہوئی<sup>۱۲</sup>۔ خود خسرو نے فخریہ کہا کہ ان کا کلام 'ہندوی' میں بھی ہے۔ ان کا ہندوی کلام اور اس کی صحت اس مقالے کا سروکار نہیں۔ اس سے یہ ہر حال اس نظریے کو تقویت ضرور ملتی ہے کہ اردو کی جنم بھومی دہلی اور اس کے اطراف کا علاقہ ہے۔ خسرو کے لسانی شعور کا اندازہ جہاں نظری طور پر ان کی آرا اور نقطہ نظر سے ہوتا ہے وہیں ان کے ہندوی کلام سے بھی اس حوالے سے کچھ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ بقول ممتاز حسین:

مگر جب مسلمانوں کی حکومت اس ویرانے میں قائم ہوئی جسے دلی کہتے ہیں اور یہ شہر شمر قند و بخارا، اصفہان و بغداد سے آنکھیں ملانے لگا، تو اس شہر کا نہ صرف سماجی ماحول، یہاں کے لوگوں کی آبادی بدل گئی بلکہ فارسی کی آمیزش سے یہاں کی زبان اور لب و لہجہ پر بھی اثر پڑا۔ فارسی کے لہجے کی درستی اور شیرینی نے یہاں کی زبان کو سنوارا، کھڑی بولی کو اس لائق بنایا کہ اس میں شعر کہا جاسکے۔ اور چوں کہ مسلمان حاکموں اور صوفیوں کا تعلق براہ راست عوام سے تھا، اس لیے ان لوگوں نے مقامی بولیوں کو اپنایا اور اس کی ترقی میں دل چسپی لی۔ چنانچہ یہ اسی ماحول اور دل چسپی کا نتیجہ تھا کہ امیر خسرو نے جہاں برج بھاشا اور اودھی میں شعر کہے وہاں کھڑی بولی میں بھی کلام موزون دیا۔ چنانچہ امیر خسرو کھڑی بولی لہجے کی ہندوی یعنی زبان دہلوی کے پہلے شاعر ہیں، اور انھوں نے اپنی اس ہندوی میں فارسی کے مقبول عام الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔ ان کی کھڑی بولی کی شاعری میں صفائی اور ستھرائی، لوج اور سنگیت جہاں ایک طرف کہیں کہیں برج اور پوربی لہجے سے [کے] اپنانے سے پیدا ہوئی ہے وہاں فارسی الفاظ کے استعمال اور اس کے دہلوی لہجے کے اپنانے سے بھی پیدا ہوئی ہے جو فارسی کے زیر اثر زیادہ شستہ ہو گیا تھا<sup>۱۳</sup>۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز کے ہندوستان میں لسانی حوالے سے جو ہیولی بن رہا تھا، خسرو نے اس میں واضح شبہیں شناخت کیں اور انھیں کامیابی سے اپنی شاعری میں برت کر دکھایا۔

خسرو کی اس بات سے کہ خراسانی ہو یا ترک، خواہ کتنی ہی سرتوڑ کو شش کر لے، زبان ہندوی پر قدرت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سے ایک بات پتہ چلتی ہے کہ اُس وقت دہلی میں فارسی، عربی اور مقامی بولیوں کے تال میل سے ایک ایسی پختہ زبان وجود میں آچکی تھی یا کم از کم آ رہی تھی جو ایک سطح پر رابطے کی زبان تھی کہ خراسانی، ترک، شیرازی، عراقی وغیرہ اہل دہلی سے بلا تکلف برت رہے تھے۔ اس زبان کی دوسری سطح عوام کی تھی جن کے لیے یہ عام بول چال کی زبان تھی اور تیسری سطح اہل انشا کی یا خواص کی تھی کہ جس میں یہ شعر و سخن کی زبان تھی۔ بولی اسی وقت زبان کے درجے پر آتی ہے جب اُس میں تحریری طور پر ادبی اور فکری مواد پیدا ہونا شروع ہو جائے۔

ایک لحاظ سے خسرو زبان دہلی کو فصیح قرار دے رہے ہیں کہ ممالک غیر کے اہل انشا اگر دہلی میں نشوونما پاتے ہیں تو ان

کی زبان بھی فصیح ہوتی ہے، خواہ ان کی مجلس یہاں کے شعر اسے نہ رہی ہو۔ یوں تو یہ اصول کی بات ہے کہ ہر زبان کا روزمرہ اور محاورہ اہل زبان میں رہ کر ہی صحیح معنوں میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی ہمارا یہی مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی زبان اہل زبان کی ہم نشینی میں بہتر سیکھی جاسکتی ہے۔

خسرو نے دیباچے میں یہ بات کئی مقامات پر فخریہ کہی کہ ہندوستان کے لوگوں نے عرب اور ایران جانے بغیر عربی اور فارسی میں اس قدر نام پیدا کیا کہ وہاں کے علماء و فضلا انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے، جب کہ دیگر علاقوں کے لوگ یہاں آکر بول چال کی زبان تک میں مہارت حاصل نہیں کر پاتے۔ جن وجوہات کی بنا پر خسرو نے فارسی کو (خصوصاً ساسانیانِ دہلی کی فارسی) کو عربی اور دیگر زبانوں پر ترجیح دی، کم و بیش ان کا اطلاق آج اردو پر ہوتا ہے۔ گذشتہ صدی میں کتنے ہی ایسے علماء و فضلا ہیں کہ جن کی عربی و فارسی دانی نے عرب ممالک اور ایران میں دھوم مچائی۔ صرف ماضی قریب میں ہمارے ہاں عربی زبان کے ایسے لوگوں کی کھکشاں موجود تھی، جیسے: علامہ انور شاہ کاشمیری (۱۸۵۷ء-۱۹۳۳ء)، مولانا عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸ء-۱۹۷۸ء)، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۳ء-۱۹۹۹ء) اور فارسی میں لغت اور قواعد نویسی سے لے کر شاعری تک ایک سے بڑھ کر ایک عالم موجود ہے۔ اگرچہ فارسی کا معاملہ عربی سے خاصا مختلف ہے۔ اہل ایران نے آسانی سے بر عظیم کی فارسی یادری کو تسلیم کر کے نہیں دیا۔ شاعری میں واحد استثنا علامہ محمد اقبال لاہوری (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کی ہے، تاہم تدوینِ متن کے شعبے میں ان کے ہاں ہمارے لوگوں نے جگہ ضرور بنائی مثلاً پاکستان سے حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳ء-۱۹۶۳ء)، وزیر الحسن عابدی (۱۹۱۳ء-۱۹۷۹ء) اور ڈاکٹر عارف نوشاہی کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کے کام کو وہاں سراہا گیا۔

خسرو و چند ایسی بحثیں اٹھاتے ہیں جو اُس دور کے حساب سے خاصی جدید کہی جاسکتی ہیں اور آج بھی دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے چند جملوں میں کئی تصورات پر اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں:

جہاں تک اُس فارسی کا تعلق ہے جو اہل زبان کے واسطے سے (یہاں) پہنچی ہے، سوائے ماوراء النہر کی فارسی کے جو ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے، کسی اور خطے کی (فارسی) عبارت درست نہیں ہے۔ خراسانی ”چہ“ کو ”چی“ کہتا ہے اور بعض ”کجا“ کو ”کجو“ بولتے ہیں لیکن کتاب میں چہ لکھتے ہیں چی نہیں لکھتے، کجا لکھتے ہیں کجو نہیں لکھتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جو تلفظ کتاب میں ہے وہی درست ہوتا ہے۔“

اہل زبان کی فارسی سے مراد فارس کی فارسی ہے۔ اہل ہند اور اہل ایران کے تعلقات تو قدیم زمانے سے تھے، مگر ایران اور ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد ان تعلقات کی نوعیت میں فرق پڑا۔ محمود غزنوی کا دور حکومت ۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء ہے۔ بر عظیم میں لسانی اعتبار سے یہ ایک اہم ترین دور ہے، جب زبانوں کے ایک دوسرے سے اخذ و قبول میں تیزی آگئی تھی۔ آنے والی صدیوں میں فارسی نے یہاں مستحکم ہونا تھا:

بر صغیر پر مسلمانوں کے سیاسی غلبے سے ایک عظیم لسانی انقلاب آگیا۔ یوں تو یہ پہلی ہی ”زبانوں کا عجائب گھر“ تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔۔۔ مسلم افواج جو بر صغیر میں داخل ہوئیں، وہ لسانی اعتبار

سے بذاتِ خود ایک کثیر لسانی افواج پر مشتمل تھیں، جس کی مشترکہ زبان دری کہلاتی تھی ۱۵۔

خسر و ہندستان اور ماوراء النہر کی فارسی کو اہل زبان کی فارسی کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ فارسی کے خراسانی لہجے کو نادرست خیال کرتے ہیں کیوں کہ ان کے مطابق ادائیگی میں ان کا تلفظ درست نہیں، اگرچہ وہ لکھتے درست تلفظ کے ساتھ ہیں۔ زبان کی فصاحت کے معاملے میں خسر و کارویہ اخلاق پرستی (putitan) کا ہے۔ برصغیر میں اس رویے نے بہر حال نقصان پہنچایا۔ جغرافیائی تبدیلیوں اور فاصلوں کے باعث ایک ہی زبان کے لہجے میں فرق آنا عین فطری ہے۔ آگے چل کر اسی رویے کا اظہار اس طرح ہوا کہ سب ہندی کو ہمارے ہی لوگوں نے معیاری لہجہ نہیں مانا، جن میں غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) اور علامہ شبلی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۳ء) بھی شامل ہیں۔ اس مسئلے پر شمس الرحمن فاروقی (۱۹۳۵ء-۲۰۲۰ء) کا ایک فکر انگیز مضمون ہے جس میں وہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ خود اہل ہندوستان کی نظر میں ان کا فارسی کلام معتبر کیوں نہیں ہے۔ غالب نے سوائے بیدل کے کسی کی فارسی دانی قبول نہ کی:

اس طرح کے عقائد کا انجام یہ ہوا کہ خود ہندوستانیوں کی نظر میں بیدل، غالب اور اقبال جیسے بڑے شاعروں کی فارسی پایہ ثبوت سے ساقط قرار پائی۔ شعر المعجم جیسی اقتدار دار کتاب میں بیدل کا صرف نام ایک دو جگہ آیا ہے۔ غالب تو اتنے کے بھی مستحق نہ ٹھہرے ۱۶۔

اردو میں فصیح اور غیر فصیح الفاظ پر ضرورت سے زیادہ اصرار، اصلاح زبان کی تحریک اور انشا اللہ خاں انشا (۱۷۵۲ء-۱۸۱۷ء) کی عربی و فارسی الفاظ کو نکال باہر کرنے کی کوشش... ان سب باتوں نے زبان کے معاملے میں تنگ نظری کو بھی جنم دیا۔ ہمارے ہاں آج بھی ایک ہی خطے میں زبان کے لہجے میں تھوڑی بہت فطری تبدیلی آنے پر اسے علیحدہ زبان کی شناخت دینے پر اصرار موجود ہے۔ آج اہل ایران کی فارسی، خصوصاً گفتاری، میں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ فارسی دری پرانی کتابوں میں موجود ہے یا پاک و ہند میں۔ ایران میں صرف بول چال یا گفتاری فارسی کو ہی فصیح قرار دینے کا نقصان یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے نوجوان اپنے کلاسیکی ورثے اور متون سے لا تعلق ہو سکتے ہیں۔ انگریزی زبان کے پھیلاؤ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ہر لہجے کو تسلیم کیا، لہذا کوئینز انگریزی ہی نہیں بلکہ آئر لینڈ، آسٹریلیا، امریکہ اور دیگر خطوں کے لہجوں کو بہت حد تک تسلیم کیا جا چکا ہے۔

خسر و کا ایک نقطہ نظر یہ بھی سامنے آتا ہے کہ لفظ جیسا بولا جائے ویسا ہی لکھا جائے۔ وہ اہل خراسان کی فارسی پر اسی لیے معترض ہیں کہ ان کے بعض الفاظ تحریر میں تو درست ہیں مگر بول چال میں نہیں۔ یعنی خسر و کتبوی اور ملفوظی الفاظ میں دوئی کے قائل نہیں۔ فارسی کے معیاری لہجے کے وہ شاید اسی لیے قائل ہیں کہ تقریر اور تحریر میں فرق نہیں۔ ایران، ماوراء النہر اور ہندوستان کی فارسی کو فصیح قرار دینے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اصول کے درجے میں اور نظری اعتبار سے تو ایسا ہی ہونا چاہیے، مگر عملی دنیا میں اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونا ہر زبان کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مختلف اقوام میں حروف کی ادائیگی کے لیے مخارج کا مسئلہ۔ اسی طرح الاملا (orthography) اور بولے گئے لفظ میں فرق ہو سکتا ہے۔ انگریزی اور اردو میں بھی بعض الفاظ میں کچھ حروف ساکت (silent) ہوتے ہیں۔ تلفظ کے معاملے میں تو انگریزی خاصی بدنام بھی ہے، مگر یہ ایک صورتِ حال ہے جسے

قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہندوی زبان اور ہندستانی فارسی کا موازنہ کر کے ہندستانی فارسی کی ایک خوبی کی طرف اہم اشارہ کرتے ہیں:

ہماری یہ فارسی (دراصل) فارسی دری ہے۔ ہندوی زبان (کا حال یہ ہے کہ) ہر سو کو س کے بعد ہر طبقے کی اصطلاحات

مختلف ہیں لیکن اس چار ہزار اور کچھ فرسنگ (کے وسیع رقبے) کی فارسی ایک ہے۔<sup>۱۷</sup>

گویا یہاں ہندوی زبان سے خسرو کی مراد دہلی یا اس کے آس پاس کی زبان نہیں، جیسا کہ اس سے قبل مراد لیا گیا۔ یہاں ہندستان کی زبانیں مراد ہیں۔ ماہر لسانیات کے طور پر خسرو سے رپورٹ دیتے ہیں کہ ہر سو کو س (ایک کوس: تین ہزار گز یا تقریباً دو میل) کے بعد زبان تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ بات آج بھی اسی طرح درست ہے۔ ایک اہم بات خسرو کی معرفت یہ پتہ چلتی ہے کہ اس وقت سارے ہندستان میں فارسی کا ایک ہی معیار تھا۔ پاکستان اور ہندستان جیسے کثیر الثقافتی ممالک میں زبانوں میں تبدیلی کا مطالعہ بہت دل چسپ ہے۔ بہر حال خسرو اس بات کو یہاں بطور خامی ہی لائے ہیں، کیوں کہ ہندوستانی فارسی کی یہ خوبی بیان کی گئی کہ اس کے لہجے میں تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندوستان کی زبانیں یہاں کی فطری اور نامیاتی زبانیں ہیں۔ ان میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، لہجے بدلتے ہیں، ہر بولی اور زبان دوسری بولی اور زبان پر اثرات ڈالتی ہے اور اثرات قبول کرتی ہے۔ ہندوستانی زبانیں عوام الناس کی زبانیں ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی فارسی نو وارد ہے۔ یہ خواص کی زبان ہے، اس لیے اس کا لہجہ محفوظ ہو گیا۔ ہندوستان میں فارسی خود تو محفوظ رہی یعنی اس کے ذخیرہ الفاظ اور لہجوں میں تبدیلی رونما نہیں ہوئی، مگر اس نے مقامی زبانوں کو بے حد متاثر کیا، یہاں تک کہ رابطے کی ایک نئی زبان کی تشکیل ہونا شروع ہوئی۔

مثنوی میں درجنوں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے خسرو کے پختہ لسانی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہر زبان کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ ہر علاقے کے لوگوں کی زبان خدا کی دی ہوئی زبان ہے، لہذا اسے برا کہنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک علمی رویہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دلائل کی بنیاد پر ہندوی اور فارسی کو باقی سب بولیوں اور زبانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے انفرادی خواص پر بات کرتے ہیں کہ ہر زبان کچھ منفرد خوبیوں کی حامل ہے۔ اسی مثنوی سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ خسرو سنسکرت سے اچھی بھلی واقفیت رکھتے تھے اور یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر انھیں قدرت ہوتی تو بادشاہ کی تعریف اسی زبان میں کرتے۔ سنسکرت کے بارے میں صاف صاف کہتے ہیں:

لیک زبانہست دگر کز سخنان  
آنست گزین نزد ہمہ برہمنان  
سنسکرت نام ز عہد کہنہش  
عامہ ندارد خبر از کن مکندش<sup>۱۸</sup>

سنسکرت شعریات سے انھوں نے کیا استفادہ کیا، یہ تحقیق کا ایک الگ باب ہے، مگر زبان کی حد تک ان کا اس کی خوبیوں کا قائل ہونا بڑا واضح ہے۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں سنسکرت کے ناگری سمیت بہت سے رسم الخط رائج تھے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو کے ان دونوں اہم متون کی مدد سے اس دور کے لسانی جغرافیے کا خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس دور کی لسانی فضا کے بارے میں ہم جس قدر واضح ہوں گے، اسی قدر اردو/ہندی سمیت بہت سی زبانوں کے ارتقا اور آپس کے تال میل کے بارے میں واضح ہوں گے۔

## حواشی و حوالہ جات

- \* (پ: ۱۹۷۲ء) اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔
- ۱- وحید مرزا، ”ادبی منظر“، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند تیسری جلد، فارسی ادب (اول) (۱۹۰۰ء-۱۹۲۶ء) مدیر خصوصی: ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر وحید مرزا (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء)، ۳۰-۳۱۔
  - ۲- ورڈزور تھ کی شعری تصنیف لیریبل بیلڈز پر تفصیلی دیباچہ (Preface to the Lyrical Ballads)، ۱۸۰۲ء والے تیسرے ایڈیشن کا حصہ ہے۔
  - ۳- نثار احمد فاروقی، ”امیر خسرو کی دو تصانیف کا جائزہ“، مشمولہ افکار امیر خسرو ایڈیشن: مدیر: صہبا لکھنوی، سحر انصاری (کراچی: مکتبہ افکار، س-ن-)، ۸۷۔
  - ۴- جمیل جاہلی، تاریخ ادبیات اردو (جلد اول) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ۲۶-۲۷۔
  - ۵- محمد حسن، ہندی ادب کی تاریخ (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ۴۔
  - ۶- امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مترجم: پروفیسر لطیف اللہ (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۴ء)، ۷۸۔
  - ۷- ایضاً، ۵۷۔
  - ۸- ایضاً، ۸۰۔
  - ۹- امیر خسرو، مثنوی نہ سسپہر (فارسی) مرتب: محمد وحید مرزا (مکتبہ: پیٹسٹ مشن پریس، ۱۹۳۸ء)، ۱۶۶۔  
ترجمہ: ہم (ہندستانی) نہایت درستی سخن کے ساتھ ہر ملک کے لوگوں کی / بولیاں بول لیتے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ، جس طرح چرواہا اپنے جانوروں کی شناخت اور رہ نمائی کرتا ہے۔  
اس کا سبب یہ ہے کہ ہر طرف کے لوگ اور اہل ہنر طلب ہنر ہی کے شوق میں ادھر آئے / لیکن حصول شرف و افتخار اور تحصیل حکمت کے لیے ہند کے برہمن کبھی ہندستان سے باہر نہ گئے۔  
امیر خسرو، مثنوی نہ سسپہر، مترجم: محمد رفیق عابد زاہدی (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۲ء)، ۸۳-۱۸۳۔
  - ۱۰- ایضاً، ۱۷۹-۱۸۰۔  
ترجمہ: الغرض اگر ہم فارسیوں، ترکوں اور عربوں ہی سے / انبساط دہلی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو لغو ہو گا / چونکہ میں ہندی نژاد ہوں اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی جگہ کی بولی بولوں / اس پورے ملک کے ہر نواح میں اپنی اپنی خاص اصطلاحات ہیں / عاریت (مانگے تاکے کی چیز) نہیں۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور، سمندری، تلنگی، گجراتی / معربی، گجری، بنگالی اور اودھی، دہلی اور اس کے ارد گرد / اور نواح کی تمام حدوں میں بولی جاتی ہے۔  
ایضاً، ۱۹۶۔
  - ۱۱- سید وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء)، ۲۳۔
  - ۱۲- گوپتی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اشپرنگر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ۲۵-۳۰۔
  - ۱۳- ممتاز حسین، ”امیر خسرو کی فارسی شاعری“، مشمولہ امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری (کراچی: نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو، ۱۹۷۶ء)، ۳۵-۳۳۔
  - ۱۴- امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مترجم: پروفیسر لطیف اللہ، ۷۸-۷۹۔
  - ۱۵- محمد عطاء اللہ خان، اردو اور فارسی کے روابط (کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۹ء)، ۹۳۔
  - ۱۶- شمس الرحمن فاروقی، ”مطالعات غالب، سبک ہندی اور بیرونی مغربی“، مشمولہ غالب کے چند پہلو (کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۱ء)، ۳۱۔
  - ۱۷- امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مترجم: پروفیسر لطیف اللہ، ۷۹۔
  - ۱۸- امیر خسرو، مثنوی نہ سسپہر (فارسی) مرتب: محمد وحید مرزا، ۱۸۰۔
- ترجمہ: لیکن ان تمام زبانوں کے علاوہ ایک خاص زبان اور بھی ہے / جو ایک برہمن کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے / اور پرانے

زمانے سے ہی اس کا نام سنسکرت ہے / لیکن عوام اس کے کن کن سے واقف نہیں۔  
امیر خسرو، مثنوی نہ سپہر، مترجم: محمد رفیق عابد زاهدی، ۱۹۶۰ء۔

## Bibliography

- Farooqi, Nisar Ahmed. “Amīr Khusrū kī do Taṣānīf kā Ja’īzah”. *Āfkār: Amīr Khusrū Edition*, Edited by Sehba Lukhnavi and Sehar Ansari, 87-88, Karachi: Maktaba-I Afkar, (n.d.).
- Farooqi, Shams ur Rehman. “Muṭālāt-i Ghālib, Sabk-i Hindī or Paervī-i Maghribī.” *Ghālib kē Chand Pehlū*, 29-55. Karachi : Anjuman-i Taraqi-i Urdu, 2001.
- Hassan, Muhammad. *Hindī Ādab kī Tārīkh*. Delhi: Educational Publishing House , 2006.
- Hussain, Mumtaz. “Āmīr Khusrū kī Fārsī Shāi’rī.” *Āmīr Khusrū Dehlvi: Hayāt aur Shā’irī*, 35-234. Karachi: National Committee bāra’ye Sāt So Sālah Taqribāt-i Āmīr Khusrū, 1976.
- Jalbi, Jameel. *Tārīkh-e-Ādbīyāt-i Urdu*. Lahore: Majlis-e-Taraqi-e-Adab, 2008.
- Khan, Muhammad Ata Ullah. *Urdu aur Fārsī kē Ravābit*. Karachi: Ānjaman-i Taraqi-i Urdu , 2009.
- Khusro, Āmīr. *Dībāchah-i Ghurat Al-Kamāl*. Trans. Lateef Ullah. Karachi : Sheharzād , 2004.
- . *Masnavī noh Sapehar*. Ed. Muhammad Rafeeq Abid Zahidi. n.d.
- . *Masnavī noh Sapehar (Fārsī)*. Ed. Muhammad Waheed Mirza. n.d.
- Mirza, Waheed. “Ādabī Manẓar.” *Tārīkh-i Ādbīyāt-i Musalmānān-i Pākistān-o-Hind*, 38-60. Lahore: Punjab University, 1971.
- Wordsworth, William. “Preface to the Lyrical Ballads.” *Lyrical Ballads*, IX-LIII. 3<sup>rd</sup> Edition. London: Duckworth and Co., 1920.